اسلام کا نظریۂ سیاسی

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

فہرست

عنوانات	صفحہ نمبر
اسلام کا نظریۂ سیاسی	3
تمام اسلامی نظریات کی اساس	4
انبیاء علیہم السلام کا مشن	4
اِلٰہ کے معنی	7
رب کا مفہوم	8
فتنہ کی جڑ	12
انبیاء کا اصل اصلاحی کام	14
نظریۂ سیاسی کے اولیں اصول	16
اسلامی اسٹیٹ کی نوعیت	18
ایک اعتراض	19
حدود اللہ کا مقصد	22
اسلامی اسٹیٹ کا مقصد	24
ایجابی اسٹیٹ	25
ہمہ گیر اسٹیٹ	25
جماعتی اور اصولی اسٹیٹ	26
نظریۂ خلافت اور اس کے سیاسی مضمرات	27
اسلامی جمہوریت کی حیثیت	28
انفرادیت اور اجتماعیت کا توازن	31

نوٹ: فہرست پر کلک کر کے مضامین تک براہِ راست پہنچا جا سکتا ہے، جبکہ ہر صفحے سے واپس فہرست پر جانے کا لنک موجود ہے۔

اسلام کا نظریۂ سیاسی

اسلام کے متعلق یہ فقرہ آپ اکثر سنتے رہتے ہیں کہ یہ ایک ''جمہوری نظام ہے'' پچھلی صدی کے آخری دور سے اس فقرے کا بار بار اعادہ کیا جارہا ہے مگر جو لوگ اس کو زبان سے نکالتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ ان میں سے ایک فی ہزار بھی ایسے نہیں ہیں جنہوں نے اس دین کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہو اور یہ سمجھنے کی کوشش کی ہو کہ اسلام میں جمہوریت کس حیثیت سے ہے اور کس نوعیت کی ہے۔ ان میں سے بعض لوگ تو اسلامی نظامِ جماعت کی چند ظاہری شکلوں کو دیکھ کر اس پر جمہوریت کا نام چسپاں کر دیتے ہیں اور اکثر ایسے ہیں جن کی ذہنیت کچھ اس طور پر بنی ہے کہ دنیا میں (اور خصوصاً ان کے حکمرانوں میں) جو چیز مقبولِ عام ہو اس کو کسی نہ کسی طرح اسلام میں موجود و ثابت کر دینا ان کے نزدیک اس مذہب کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ شاید وہ اسلام کو اس یتیم بچے کی طرح سمجھتے ہیں جو ہلاکت سے بس اس طرح بچ سکتا ہے کہ کسی بااثر شخص کی سرپرستی اس کو حاصل ہو جائے یا پھر غالباً ان کا خیال یہ ہے کہ ہماری عزت محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے قائم نہیں ہو سکتی، بلکہ صرف اسی طرح قائم ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے مسلک میں دنیا کے کسی چلتے ہوئے مسلک کے اصولوں کی جھلک دکھا دیں۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ جب دنیا میں اشتراکیت کا غلغلہ بلند ہوا تو مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے پکارنا شروع کیا کہ اشتراکیت تو محض اسلام ہی کا ایک جدید ایڈیشن ہے اور جب ڈکٹیٹرشپ کا آوازہ اٹھا تو کچھ دوسرے لوگوں نے اطاعت امیر' اطاعت امیر کی صدائیں بلند کرنی شروع کر دیں اور کہنے لگے کہ یہاں سارا نظام جماعت ڈکٹیٹرشپ ہی پر قائم ہے' غرض اسلام کا نظریۂ سیاسی اس زمانہ میں ایک چیستان' ایک چوں چوں کا مربہ بن کر رہ گیا ہے' جس میں سے ہر وہ چیز نکال کر دکھا دی جاتی ہے' جس کا بازار میں چلن ہو۔ ضرورت ہے کہ باقاعدہ علمی طریقہ سے اس

امر کی تحقیق کی جائے کہ فی الواقع اسلام کا سیاسی نظریہ ہے کیا؟ اس طرح نہ صرف ان پراگندہ خیالوں کا خاتمہ ہو جائے گا جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور نہ صرف ان لوگوں کا منہ بند ہو جائے گا جنہوں نے حال میں علی الاعلان یہ لکھ کر اپنی جہالت کا ثبوت دیا تھا کہ ’’اسلام سرے سے کوئی سیاسی و تمدنی نظام تجویز ہی نہیں کرتا‘‘۔ بلکہ درحقیقت تاریکیوں میں بھٹکنے والی دنیا کے سامنے ایک ایسی روشنی نمودار ہو جائے گی جس کی وہ سخت حاجت مند ہے‘ اگرچہ اپنی اس حاجت مندی کا شعور نہیں رکھتی۔

تمام اسلامی نظریات کی اساس

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریقہ ہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے جس میں اِدھر اُدھر سے مختلف چیزیں لا کر جمع کر دی گئی ہوں‘ بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے جس کی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے‘ اس کے بڑے بڑے ارکان سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اس نے جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کیے ہیں‘ ان سب کی روح اور ان کا جوہر اس کے اصول اولیہ ہی سے ماخوذ ہے‘ ان اصول اولیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں اور جڑوں سے تنا اور تنے سے شاخیں اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں اور خوب پھیل جانے کے باوجود اس کی ایک ایک پتّی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے۔ پس آپ اسلامی زندگی کے جس شعبے کو بھی سمجھنا چاہیں‘ آپ کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کی جڑ کی طرف رجوع کریں‘ کیونکہ اس کے بغیر آپ اس کی روح کو نہیں پا سکتے۔

انبیاء علیہم السلام کا مشن

اسلام کے متعلق یہ بات تو آپ مجملاً جانتے ہی ہیں کہ یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا مشن

ہے۔ یہ صرف محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشن نہیں ہے' بلکہ انسانی تاریخ کے قدیم ترین دور سے جتنے انبیاء بھی خدا کی طرف سے آئے ہیں' ان سب کا یہی مشن تھا۔ اس کے ساتھ اجمالی طور پر یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ یہ سب نبی ایک خدا کی خدائی منوانے اور اسی کی عبادت کرانے آئے تھے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کا پردہ اٹھا کر ذرا آپ گہرائی میں اتریں۔ سب کچھ اسی پردے کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ تجسس کی نگاہ ڈال کر اچھی طرح دیکھیے کہ ایک خدا کی خدائی منوانے سے مقصد کیا تھا اور صرف اسی کی عبادت کرانے کا مطلب کیا تھا؟ اور آخر میں ایسی کون سی بات تھی کہ جہاں کسی اللہ کے بندے نے **مَالَكُم مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ** (الاعراف:٦٥) کا اعلان کیا اور ساری طاغوتی طاقتیں جھاڑ کا کانٹا بن کر اس کو چمٹ گئیں؟ اگر بات صرف اتنی ہی تھی جتنی آج کل سمجھی جاتی ہے کہ مسجد میں خدائے واحد کے سامنے سجدہ کرلو اور پھر باہر نکل کر حکومتِ وقت (جو بھی وقت کی حکومت ہو) کی وفاداری اور اطاعت میں لگ جاؤ تو کس کا سر پھرا تھا کہ اتنی سی بات کے لیے خواہ مخواہ اپنی وفادار رعایا کی مذہبی آزادی میں مداخلت کرتا؟

آئیے ہم تحقیق کر کے دیکھیں کہ خدا کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کا اور دنیا کی دوسری طاقتوں کا اصل جھگڑا کس بات پر تھا؟

قرآن میں ایک جگہ نہیں' بکثرت مقامات پر یہ بات صاف کردی گئی ہے کہ کفار و مشرکین' جن سے انبیاؑ کی لڑائی تھی' اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے' ان سب کو تسلیم تھا کہ اللہ ہے اور وہی زمین و آسمان کا خالق اور خود ان کفار و مشرکین کا خالق بھی ہے۔ کائنات کا سارا انتظام اسی کے اشارے سے ہو رہا ہے' وہی پانی برساتا ہے' وہی ہواؤں کو گردش دیتا ہے' اسی کے ہاتھ میں سورج اور چاند اور زمین سب کچھ ہیں:

قُل لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَن فِيهَا إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ قُلْ مَن رَّبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ قُلْ مَن بِيَدِهِ

مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَo سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ فَأَنَّى تُسْحَرُونَo (المومنون:۸۴۔۸۹)

''ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے' وہ کس کا ہے' بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے اللہ کا ہے۔ کہو پھر تم غور نہیں کرتے؟ ان سے پوچھو' ساتوں آسمانوں کا رب اور عرشِ عظیم کا رب کون ہے؟ کہیں گے اللہ۔ کہو پھر تم اس سے ڈرتے نہیں؟ ان سے پوچھو وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے مگر کوئی اس کے مقابلے میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ۔ کہو پھر تم کس دھوکے میں ڈال دیے گئے ہو؟''

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّى يُؤْفَكُونَ... وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّن نَّزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِن بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللَّهُ... (العنکبوت:۶۱۔۶۳)

''اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ اور کس نے سورج اور چاند کو تابع فرمان بنا رکھا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر یہ آخر کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں؟۔۔۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی اتارا اور کس نے مَری ہوئی زمین کو روئیدگی بخشی؟ وہ ضرور کہیں گے اللہ نے''۔

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّى يُؤْفَكُونَo (الزخرف:۸۷)

''اور اگر تم ان سے پوچھو کہ تم کو کس نے پیدا کیا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں؟''

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے ہونے میں اور اس کے خالق ہونے

اور مالک ارض و سما ہونے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ لوگ ان باتوں کو خود ہی مانتے تھے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ انہی باتوں کو منوانے کے لیے تو انبیاؑ کے آنے کی ضرورت تھی ہی نہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاؑ کی آمد کس لیے تھی اور جھگڑا کس چیز کا تھا؟

قرآن کہتا ہے کہ سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ انبیاؑ کہتے تھے جو تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہے، وہ تمہارا رب اور اِلٰہ بھی ہے، اس کے سوا کسی کو اِلٰہ اور رب نہ مانو مگر دنیا اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔

آیئے! ذرا پھر تجسس کریں کہ اس جھگڑے کی تہہ میں کیا ہے؟ اِلٰہ سے کیا مراد ہے؟ رب کسے کہتے ہیں؟ انبیاؑ کو کیوں اصرار تھا کہ صرف اللہ ہی کو اِلٰہ اور رب مانو؟ اور دنیا کیوں اس بات پر لڑنے کھڑی ہو جاتی تھی؟

اِلٰہ کے معنی

اِلٰہ کے معنی آپ سب جانتے ہیں کہ معبود کے ہیں، مگر معاف کیجیے گا معبود کے معنی آپ بھول گئے ہیں۔ معبود کا مادہ عبد ہے، عبد بندے اور غلام کو کہتے ہیں۔ عبادت کے معنی محض پوجا کے نہیں ہیں، بلکہ بندہ اور غلام جو زندگی غلامی اور بندگی کی حالت میں بسر کرتا ہے، وہ پوری کی پوری سراسر عبادت ہے۔ خدمت کے لیے کھڑا ہونا، احترام میں ہاتھ باندھنا، اعترافِ بندگی میں سر جھکانا، جذبۂ وفاداری سے سرشار ہونا، فرمانبرداری میں دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کرنا، جس کام کا اشارہ ہو، اسے بجا لانا، جو کچھ آقا طلب کرے، اسے پیش کر دینا، اس کی طاقت و جبروت کے آگے ذلت اور عاجزی اختیار کرنا، جو قانون وہ بنائے اس کی اطاعت کرنا، جس کے خلاف وہ حکم دے اس پر چڑھ دوڑنا، جہاں اس کا فرمان ہو سر تک کٹوا دینا۔ یہ عبادت کا اصل مفہوم ہے اور آدمی کا معبود حقیقت میں وہی ہے جس کی عبادت وہ اس طرح کرتا ہے۔

رب کا مفہوم

اور ''رب'' کا مفہوم کیا ہے؟ عربی زبان میں رب کے اصلی معنی پرورش کرنے والے کے ہیں اور چونکہ دنیا میں پرورش کرنے والے ہی کی اطاعت وفرمانبرداری کی جاتی ہے' لہٰذا رب کے معنی مالک اور آقا کے بھی ہوئے' چنانچہ عربی محاورہ میں مال کے مالک کو رب المال اور صاحبِ خانہ کو رب الدار کہتے ہیں۔ آدمی جس کو اپنا رازق اور مربی سمجھے' جس سے نوازش اور سرفرازی کی امید رکھے' جس سے عزت اور ترقی اور امن کا متوقع ہو' جس کی نگاہِ لطف کے پھر جانے سے اپنی زندگی برباد ہو جانے کا خوف کرے' جس کو اپنا آقا اور مالک قرار دے اور جس کی فرمانبرداری اور اطاعت کرے' وہی اس کا رب ہے۔

ان دونوں لفظوں کے معنی پر نگاہ رکھیے اور پھر غور سے دیکھیے' انسان کے مقابلہ میں یہ دعویٰ لے کر کون کھڑا ہو سکتا ہے کہ میں تیرا اِلٰہ ہوں اور میں تیرا رب ہوں' میری بندگی وعبادت کر؟ کیا درخت؟ پتھر؟ دریا؟ جانور؟ سورج؟ چاند؟ تارے؟ کسی میں بھی یہ یارا ہے کہ وہ انسان کے سامنے آ کر یہ دعویٰ پیش کر سکے؟ نہیں ہرگز نہیں! وہ صرف انسان ہی ہے جو انسان کے مقابلہ میں خدائی کا دعویٰ لے کر اٹھتا ہے اور اُٹھ سکتا ہے۔ خدائی کی ہوس انسان ہی کے سر میں سما سکتی ہے۔ انسان ہی کی، حد سے بڑھی خواہش اقتدار یا خواہش انتفاع اسے اس بات پر ابھارتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خدا بنے' ان سے اپنی بندگی کرائے' ان کے سر اپنے آگے جھکوائے' ان پر اپنا حکم چلائے' ان کو اپنی خواہشات کے حصول کا آلہ بنائے۔ یہ خدا بننے کی لذت ایسی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی لذیذ چیز انسان آج تک دریافت نہیں کر سکا ہے' جس کو کچھ طاقت یا دولت' یا چالاکی یا ہوشیاری یا کسی نوع کا کچھ زور حاصل ہے' وہ یہی چاہتا ہے کہ اپنے فطری اور جائز حدود سے آگے بڑھے' پھیل جائے اور آس پاس کے انسانوں پر جو اس کے مقابلہ میں ضعیف یا مفلس یا بیوقوف یا کسی حیثیت سے بھی کمزور ہوں' اپنی خدائی کا سکہ جما دے۔

اس قسم کی ہوسِ خداوندی رکھنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں اور دو مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن میں زیادہ جرأت ہوتی ہے یا جن کے پاس خدائی کے ٹھاٹھ جمانے کے لیے کافی ذرائع ہوتے ہیں، وہ براہِ راست اپنی خدائی کا دعویٰ پیش کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک وہ فرعون تھا جس نے اپنی بادشاہی اور اپنے لشکروں کے بَل بُوتے پر مصر کے باشندوں سے کہہ دیا کہ **اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی** (النازعات:۲۴) ''میں تمہارا سب سے اونچا رب ہوں'' اور **مَا عَلِمْتُ لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرِیْ** (القصص:۳۸) ''میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا اور بھی کوئی اِلٰہ ہے''۔ جب حضرت موسیٰؑ نے اس کے سامنے اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا اور اس سے کہا کہ تو خود بھی الٰہ العالمین کی بندگی اختیار کر، تو اس نے کہا کہ میں تم کو جیل بھیج دینے کی قدرت رکھتا ہوں لہٰذا تم مجھ کو اِلٰہ تسلیم کرو۔ **لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰھًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّکَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ** (الشعراء:۲۹) ''اسی طرح ایک وہ بادشاہ تھا جس سے حضرت ابراہیمؑ کی بحث ہوئی تھی، قرآن میں اس کا ذکر جن الفاظ کے ساتھ آیا ہے، انہیں ذرا غور سے پڑھیے:

> **أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْ حَآجَّ إِبْرَاهِيْمَ فِيْ رِبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيْمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ قَالَ أَنَا أُحْيِيْ وَأُمِيْتُ قَالَ إِبْرَاهِيْمُ فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ...** (البقرہ:۲۵۸)
>
> ''تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے ابراہیمؑ سے حجت کی، اس بارے میں کہ ابراہیمؑ کا رب کون ہے اور یہ بحث اس نے اس لیے کہ کہ اللہ نے اس کو حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا کہ زندگی اور موت میرے ہاتھ میں ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا: اچھا اللہ تو سورج کو مشرق کی طرف سے لاتا ہے تو ذرا مغرب کی طرف سے نکال لا۔ یہ کافر ہکا بکا رہ گیا''۔

غور کیجیے! وہ کافر ہکا بکا کیوں رہ گیا؟ اس لیے کہ وہ اللہ کے وجود کا منکر نہ تھا۔ وہ اس بات کا بھی قائل تھا کہ کائنات کا فرمانروا اللہ ہی ہے۔ سورج کو وہی نکالتا اور وہی غروب کرتا ہے۔

جھگڑا اس بات میں نہ تھا کہ کائنات کا مالک کون ہے بلکہ اس بات میں تھا کہ انسانوں کا اور خصوصاً سرزمینِ عراق کے باشندوں کا مالک کون ہے۔ وہ اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتا تھا بلکہ اس بات کا دعویٰ رکھتا تھا کہ سلطنتِ عراق کے باشندوں کا رب میں ہوں اور یہ دعویٰ اس بنا پر تھا کہ حکومت اس کے ہاتھ میں تھی، لوگوں کی جانوں پر وہ قابض ومتصرف تھا، اپنے آپ میں یہ قدرت پاتا تھا کہ جسے چاہے پھانسی پر لٹکادے اور جس کی چاہے جان بخشی کردے۔ یہ سمجھتا تھا کہ میری زبان قانون ہے اور میرا حکم ساری رعایا پر چلتا ہے۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ سے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ تم مجھے رب تسلیم کرو، میری بندگی اور عبادت کرو۔ مگر جب حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ میں تو اسی کو رب مانوں گا اور اسی کی بندگی وعبادت بھی کروں گا جو زمین وآسمان کا رب ہے اور جس کی عبادت یہ سورج کر رہا ہے تو وہ حیران رہ گیا اور اس لیے حیران رہ گیا کہ ایسے شخص کو کیوں کر قابو میں لاؤں۔

یہ خدائی جس کا دعویٰ فرعون اور نمرود نے کیا تھا، کچھ انہی دو آدمیوں تک محدود نہ تھی۔ دنیا میں ہر جگہ فرمانرواؤں کا یہی دعویٰ تھا۔ ایران میں بادشاہ کے لیے خدا اور خداوند کے الفاظ مستعمل تھے اور ان کے سامنے پورے مراسمِ عبودیت بجالائے جاتے تھے، حالانکہ کوئی ایرانی ان کو خدائے خدائگاں (یعنی اللہ) نہیں سمجھتا تھا اور نہ وہ خود اس کے مدعی تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں فرمانروا خاندان اپنا نسب دیوتاؤں سے ملاتے تھے۔۔۔ چنانچہ سورج بنسی اور چندر بنسی آج تک مشہور ہیں۔۔۔ راجہ کو اَن داتا یعنی رازق کہا جاتا تھا اور اس کے سامنے سجدے کیے جاتے تھے، حالانکہ پریشور ہونے کا دعویٰ نہ کسی راجہ کو تھا اور نہ پرجا ہی ایسا سمجھتی تھی۔ ایسا ہی حال دنیا کے دوسرے ممالک کا بھی تھا اور آج بھی ہے۔ بعض جگہ فرمانرواؤں کے لیے اِلٰہ اور رب کے ہم معنی الفاظ اب بھی صریحاً بولے جاتے ہیں۔ مگر جہاں یہ نہیں بولے جاتے وہاں اسپرٹ وہی ہے جو ان الفاظ کے مفہوم میں پوشیدہ ہے۔ اس نوع کے دعوائے خداوندی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی صاف الفاظ میں اِلٰہ اور رب ہونے ہی کا دعویٰ کرے۔ نہیں وہ سب لوگ جو انسانوں پر اس اقتدار، اس فرمانروائی وحکمرانی، اس آقائی وخداوندی کو قائم کرتے ہیں جسے

فرعون اور نمرود نے قائم کیا تھا' دراصل وہ اِلٰہ اور رب کے معنی ومفہوم کا دعویٰ کرتے ہیں' چاہے الفاظ کا دعویٰ نہ کریں اور وہ سب لوگ جو ان کی اطاعت و بندگی کرتے ہیں' وہ بہرحال ان کے الٰہ ورب ہونے کو تسلیم کرتے ہیں' چاہے زبان سے یہ الفاظ نہ کہیں۔

غرض ایک قسم تو انسانوں کی وہ ہے جو براہِ راست اپنی الٰہیّت اور ربوبیّت کا دعویٰ کرتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس کے پاس اتنی طاقت نہیں ہوتی' اتنے ذرائع نہیں ہوتے کہ خود ایسا دعویٰ لے کر اٹھیں اور اسے منوالیں۔ البتہ چالاکی اور فریب کاری کے ہتھیار ہوتے ہیں جس سے وہ عام انسانوں کے دل و دماغ پر جادو کر سکتے ہیں۔ سوان ذرائع سے کام لے کر وہ کسی روح' کسی دیوتا' کسی بت' کسی قبر' کسی سیارے یا کسی درخت کو اِلٰہ بنا دیتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ تمہیں نفع اور ضرر پہنچانے پر قادر ہیں۔ یہ تمہاری حاجت روائی کر سکتے ہیں۔ یہ تمہارے ولی اور محافظ اور مددگار ہیں۔ ان کو خوش نہ کرو گے تو یہ تمہیں قحط اور بیماریوں اور مصیبتوں میں مبتلا کر دیں گے' انہیں خوش کر کے حاجتیں طلب کرو گے تو یہ تمہاری مدد کو پہنچیں گے۔ مگر انہیں خوش کرنے اور ان کو تمہارے حال پر متوجہ کرنے کے طریقے ہم کو معلوم ہیں' ان تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہی بَن سکتے ہیں۔ لہٰذا ہماری بزرگی تسلیم کرو' ہمیں خوش کرو اور ہمارے ہاتھ میں اپنی جان' مال' آبرو سب کچھ دے دو۔ بہت سے بیوقوف انسان اس جال میں پھنس جاتے ہیں اور یوں جھوٹے خداؤں کی آڑ میں پروہتوں اور پجاریوں اور مجاوروں کی خداوندی قائم ہوتی ہے۔

اسی نوع میں کچھ دوسرے لوگ ہیں جو کہانت اور نجوم اور فال گیری اور تعویذ گنڈوں اور منتروں کے وسیلے اختیار کرتے ہیں۔ کچھ اور لوگ ہیں جو اللہ کی بندگی کا اقرار تو کرتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ تم براہِ راست اللہ تک نہیں پہنچ سکتے' اس کی بارگاہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہیں۔ عبادت کے مراسم ہمارے ہی واسطے سے ادا ہوں گے اور تمہاری پیدائش سے لے کر موت تک ہر مذہبی رسم ہمارے ہاتھوں سے انجام پائے گی۔ کچھ دوسرے ہیں جو اللہ کی کتاب کے حامل بن جاتے ہیں' عام لوگوں کو اس کے علم سے محروم کر دیتے ہیں اور خود اپنے زعم میں خدا کی زبان بَن کر حلال وحرام کے احکام دینے شروع کر دیتے ہیں۔ یوں اُن کی زبان قانون بَن جاتی ہے اور وہ

انسانوں کو خدا کے بجائے خود اپنے حکم کا تابع بنا لیتے ہیں۔ یہی اصل ہے اس برہمنیت اور پاپائیت کی جو مختلف ناموں اور مختلف صورتوں سے قدیم ترین زمانہ سے آج تک دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے اور جس کی بدولت بعض خاندانوں، نسلوں یا طبقوں نے عام انسانوں پر اپنی سیادت کا سکہ جما رکھا ہے۔

فتنہ کی جڑ

اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں فتنہ کی اصل جڑ اور فساد کا اصل سرچشمہ انسان پر انسان کی خدائی ہے۔ خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ۔ اسی سے خرابی کی ابتدا ہوئی اور اسی سے آج بھی بِس کے زہریلے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو خیر انسان کی فطرت کے سارے راز ہی جانتا ہے مگر اب تو ہزار ہا برس کے تجربہ سے خود ہم پر بھی یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی ہے کہ انسان کسی نہ کسی کو اِلٰہ اور رب مانے بغیر رَہ ہی نہیں سکتا گویا کہ اس کی زندگی محال ہے اگر کوئی اس کا اِلٰہ اور رب نہ ہو۔ اگر اللہ کو نہ مانے گا تب بھی اسے اِلٰہ اور رب سے چھٹکارا نہیں ہے۔ بلکہ اس صورت میں بہت سے اِلٰہ اور ارباب اس کی گردن پر مسلط ہو جائیں گے۔

آج بھی آپ جدھر نظر ڈالیں گے، یہی نظر آئے گا کہ کہیں ایک قوم دوسری قوم کی الٰہہ ہے، کہیں ایک طبقہ دوسرے طبقوں کا الٰہ ہے، کہیں ایک پارٹی نے الٰہیّت و ربوبیّت کے مقام پر قبضہ کر رکھا ہے، کہیں قومی ریاست خدائی کے مقام پر براجمان ہے اور کہیں کوئی ڈکٹیٹر مَـــا عَلِمۡتُ لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرِیۡ کی منادی کر رہا ہے۔ انسان کسی ایک جگہ بھی اِلٰہ کے بغیر نہ رہا۔

پھر انسان پر انسان کی خدائی قائم ہونے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہی جو ایک کم ظرف آدمی کو پولیس کمشنر بنا دینے، یا ایک جاہل تنگ نظر کو وزیر اعظم بنا دینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اول تو خدائی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اس شراب کو پی کر کبھی اپنے قابو میں نہیں رہ سکتا اور بالفرض اگر وہ قابو میں رہ بھی جائے تو خدائی کے فرائض انجام دینے کے لیے جس علم کی ضرورت ہے اور جس

بے لوثی و بے غرضی اور بے نیازی کی حاجت ہے، وہ انسان کہاں سے لائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں انسانوں پر انسانوں کی الٰہیّت و ربوبیّت قائم ہوئی، وہاں ظلم، طغیان، ناجائز انتفاع، بے اعتدالی اور ناہمواری نے کسی نہ کسی صورت سے راہ پا ہی لی۔ وہاں انسانی روح اپنی فطری آزادی سے محروم ہو کر ہی رہی، وہاں انسان کے دل و دماغ پر اس کی پیدائشی قوتوں اور صلاحیتوں پر ایسی بندشیں عائد ہو کر رہیں جنہوں نے انسانی شخصیت کے نشو و ارتقا کو روک دیا۔ کس قدر سچ فرمایا اس صادق و مصدوق علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام نے:

قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِنِّیْ خَلَقْتُ عِبَادِیْ حُنَفَآءَ فَجَاءَ تْھُمُ الشَّیٰطِیْنُ فَاجْتَالَتْھُمْ مِنْ دِیْنِھِمْ وَ حَرَّمَتْ عَلَیْھِمْ مَا اَحْلَلْتُ لَھُمْ. (حدیث قدسی)

''اللہ عز و جل فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو صحیح فطرت پر پیدا کیا تھا۔ پھر شیطانوں نے ان کو آن گھیرا، انہیں فطرت کی راہِ راست سے بھٹکا لے گئے اور جو کچھ میں نے ان کے لیے حلال کیا تھا، ان شیطانوں نے ان کو اس سے محروم کر کے رکھ دیا''۔

جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، یہ ہے وہ چیز جو انسانوں کے سارے مصائب، اس کی ساری تباہیوں، اس کی تمام محرومیوں کی اصل جڑ ہے۔ یہ اس کی ترقی میں اصلی رکاوٹ ہے۔ یہ وہ روگ ہے جو اس کے اخلاق اور اس کی روحانیت کو اس کی علمی و فکری قوتوں کو، اس کے تمدن اور اس کی معاشرت کو، اس کی سیاست اور اس کی معیشت کو اور قصہ مختصر اس کی انسانیت کو تپ دق کی طرح کھا گیا ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے کھا رہا ہے اور آج تک کھائے چلا جاتا ہے۔ اس روگ کا علاج بجز اس کے کچھ ہے ہی نہیں کہ انسان سارے ارباب اور تمام الٰہوں کا انکار کر کے صرف اللہ کو اپنا الٰہ اور صرف رب العالمین کو اپنا رب قرار دے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اس کی نجات کے لیے نہیں ہے۔ کیونکہ ملحد اور دہریہ بَن کر بھی تو وہ الٰہوں اور ارباب سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔

انبیاء کا اصل اصلاحی کام

یہی وہ بنیادی اصلاح تھی جو انبیاء علیہم السلام نے انسانی زندگی میں کی۔ وہ دراصل انسان پر انسان کی خدائی تھی جس کو مٹانے کے لیے یہ لوگ آئے۔ ان کا اصلی مشن یہ تھا کہ انسان کو اس ظلم سے، ان جھوٹے خداؤں کی بندگی سے، اس طغیان اور ناجائز انتفاع سے نجات دلائیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جو انسان انسانیت کی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں، انہیں دھکیل کر پھر اس حد میں واپس پہنچائیں، جو اس حد سے نیچے گرا دیے گئے ہیں، انہیں ابھار کر اس حد تک اٹھا لائیں اور سب کو ایک ایسے عادلانہ نظامِ زندگی کا پابند بنا دیں جس میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا عبد ہو نہ معبود، بلکہ سب ایک اللہ کے بندے بن جائیں۔ ابتدا سے جتنے نبی دنیا میں آئے، ان سب کا ایک ہی پیغام تھا کہ **یَاقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَالَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ** ''لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا اِلٰہ نہیں ہے''۔ یہی حضرت نوحؑ نے کہا۔ یہی حضرت ہودؑ نے کہا۔ یہی حضرت صالحؑ نے کہا۔ یہی حضرت شعیبؑ نے کہا اور اسی کا اعلان محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا ہے:

> **إِنَّمَا أَنَا مُنذِرٌ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا...** (ص:٦٥-٦٦)
>
> ''میں تمہیں متنبہ کرنے والا ہوں۔ کوئی اِلٰہ نہیں ہے بجز اس ایک اللہ کے جو سب پر غالب ہے۔ جو رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ہر اس چیز کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہے''۔
>
> **إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ.. وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ..** (الاعراف:٥٤)
>
> ''یقیناً تمہارا رب وہی ہے جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو۔۔۔ اور سورج اور چاند اور تاروں کو۔ سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ خبردار! خلق بھی اسی کی ہے اور حکومت بھی اسی کی''۔

ذَلِكُمُ اللّهُ رَبُّكُمْ لا إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ۝ (الانعام:۱۰۲)

''وہی ایک اللہ تمہارا رب ہے' اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے' وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے''۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ. (البینۃ:۵)

''لوگوں کو کوئی حکم نہیں دیا گیا بجز اس کے کہ اللہ کی بندگی کریں' اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کر کے یکسو ہو کر''۔

تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ.. (آلِ عمران:۶۴)

''آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے' یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی ہم بندگی نہ کریں اور خدائی میں کسی کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب نہ بنا لے''۔

یہی وہ منادی تھی جس نے انسان کی روح اور اس کی عقل و فکر اور اس کی ذہنی و مادّی قوتوں کو غلامی کی ان بندشوں سے رہا کر دیا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے اور وہ بوجھ ان پر سے اتارے جن کے نیچے وہ دبے ہوئے تھے۔ یہ انسان کے لیے حقیقی آزادی کا چارٹر تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی کارنامے کے متعلق قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

..يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ.. (الاعراف:۱۵۷)

''یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور ان بندھوں کو کاٹتا ہے جن میں وہ کسے ہوئے تھے''۔

نظریۂ سیاسی کے اولیں اصول

انبیاء علیہم السلام نے انسانی زندگی کے لیے جو نظام مرتب کیا اس کا مرکز و محور، اس کی روح اور اس کا جوہر یہی عقیدہ ہے اور اسی پر اسلام کے نظریۂ سیاسی کی بنیاد بھی قائم ہے۔ اسلامی سیاست کا سنگِ بنیاد یہ قاعدہ ہے کہ حکم دینے اور قانون بنانے کے اختیارات تمام انسانوں سے فرداً فرداً اور مجتمعاً سلب کر لیے جائیں، کسی شخص کا یہ حق تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ حکم دے اور دوسرے اس کی اطاعت کریں۔۔۔ وہ قانون بنائے اور دوسرے اس کی پابندی کریں۔ یہ اختیار صرف اللہ کو ہے۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ... (یوسف:۴۰)

''حکم سوائے اللہ کے کسی اور کا نہیں۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے''۔

يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلّٰهِ...

(آلِ عمران:۱۵۴)

''وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہو کہ اختیارات تو سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں''۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلَالٌ وَهٰذَا حَرَامٌ... (النحل:۱۱۶)

''اپنی زبانوں سے یونہی غلط سلط نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام''۔

وَمَن لَّمْ یَحْکُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِکَ هُمُ الْکَافِرُونَ o (المائدۃ:۴۴)

''جو خدا کی نازل کی ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی دراصل کافر ہیں''۔

اس نظریہ کے مطابق حاکمیت (Sovereignty) صرف خدا کی ہے۔قانون ساز (Law Giver) صرف خدا ہے۔کوئی انسان خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو'بذاتِ خود حکم دینے اور منع کرنے کا حق دار نہیں۔ نبی خود بھی اللہ کے حکم ہی کا پیرو ہے۔إِنْ أَتَّبِعُ إِلاَّ مَا یُوحَی إِلَیَّ (الانعام:۵۰) ''میں تو صرف اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے''۔عام انسان نبی کی اطاعت پر صرف اس لیے مامور ہیں کہ وہ اپنا حکم نہیں بلکہ خدا کا حکم بیان کرتا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلاَّ لِیُطَاعَ بِإِذْنِ اللّهِ... (النساء:۶۴)

''ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے' اس لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن (Sanction) کے تحت اس کی اطاعت کی جائے''۔

أُوْلَـئِکَ الَّذِیْنَ آتَیْنَاهُمُ الْکِتَابَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّةَ..

(الانعام:۸۹)

''یہ نبی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے اپنی کتاب دی۔حکم (Authority) سے سرفراز کیا اور نبوت عطا کی''۔

مَا کَانَ لِبَشَرٍ أَن یُؤْتِیَهُ اللّهُ الْکِتَابَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُولَ لِلنَّاسِ کُونُواْ عِبَاداً لِّی مِن دُونِ اللّهِ وَلَـکِن کُونُواْ رَبَّانِیِّیْنَ... (آلِ عمران:۷۹)

''کسی بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اسے کتاب اور حکم اور نبوت سے سرفراز کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کے بجائے میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم ربانی بنو''۔

پس اسلامی اسٹیٹ کی ابتدائی خصوصیات جو قرآن مجید کی مذکورہ بالا تصریحات سے نکلتی

ہیں، درج ذیل ہیں:

۱۔ کوئی شخص، خاندان، طبقہ یا گروہ بلکہ اسٹیٹ کی ساری آبادی مل کر بھی حاکمیت کی مالک نہیں ہے۔ حاکم اصلی صرف خدا ہے اور باقی سب محض رعیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۲۔ قانون سازی کے اختیارات بھی خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہیں، سارے مسلمان مل کر بھی نہ اپنے لیے کوئی قانون بنا سکتے ہیں اور نہ خدا کے بنائے ہوئے کسی قانون میں ترمیم کر سکتے ہیں۔

۳۔ اسلامی اسٹیٹ بہرحال اس قانون پر قائم ہوگا جو خدا کی طرف سے اس کے نبی نے دیا ہے اور اس اسٹیٹ کو چلانے والی گورنمنٹ صرف اس حال میں اور اس حیثیت سے اطاعت کی مستحق ہوگی کہ وہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والی ہو۔

اسلامی اسٹیٹ کی نوعیت

ایک شخص بیک نظر ان خصوصیات کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ اسلامی ریاست مغربی طرز کی لادینی جمہوریت (Secular Democracy) نہیں ہے، اس لیے کہ جمہوریت تو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے نام ہی اس طرزِ حکومت کا ہے جس میں ملک کے عام باشندوں کو حاکمیتِ اعلیٰ حاصل ہو۔ انہی کی رائے سے قوانین بنیں اور انہی کی رائے سے قوانین بنیں اور انہی کی رائے سے قوانین میں تغیر و تبدل ہو۔ جس قانون کو وہ چاہیں نافذ ہو اور جسے وہ نہ چاہیں وہ کتاب آئین میں سے محو کر دیا جائے۔ یہ بات اسلام میں نہیں ہے یہاں ایک بالاتر بنیادی قانون خود اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعہ سے دیتا ہے جس کی اطاعت ریاست اور قوم کو کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا اس معنی میں اسے جمہوریت نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے لیے زیادہ صحیح نام ''الٰہی حکومت'' ہے جس کو انگریزی میں (Theocracy) کہتے ہیں مگر یورپ جس تھیاکریسی سے واقف ہے، اسلامی

تھیا کریسی اس سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ اس تھیا کریسی سے واقف ہے جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے[1] اور عملاً اپنی خدائی عام باشندوں پر مسلط کر دیتا ہے۔ ایسی حکومت کو تو الٰہی حکومت کے بجائے شیطانی حکومت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ بخلاف اس کے اسلام جس تھیا کریسی کو پیش کرتا ہے، وہ کسی مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور یہ عام مسلمان اسے خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق چلاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرزِ حکومت کو (Theo-Democracy) یعنی ''الٰہی جمہوری حکومت'' کے نام سے موسوم کروں گا۔ کیونکہ اس میں خدا کے اقتدارِ اعلیٰ (Paramountcy) کے تحت مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حاکمیت (Limited Popular Sovereignty) عطا کی گئی ہے۔ اس میں عاملہ (Executive) اور مقنّنہ مسلمانوں کی رائے سے بنے گی۔ مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے۔ سارے انتظامی معاملات اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے، مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہوگا، وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل نہیں بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہوگا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔ اس لحاظ سے یہ ڈیموکریسی ہے۔ مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، جہاں خدا اور اس کے رسول کا حکم موجود ہو، وہاں مسلمانوں کے کسی امیر کو، کسی لیجسلیچر کو، کسی مجتہد اور عالمِ دین کو بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو مل کر بھی اس حکم میں یک سرِ مو ترمیم کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، اس لحاظ سے یہ تھیا کریسی ہے۔

ایک اعتراض

آگے بڑھنے سے پہلے میں اس امر کی تھوڑی سی تشریح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام میں ڈیموکریسی پر یہ حدود و قیود کیوں عائد کیے گئے ہیں اور ان حدود و قیود کی نوعیت کیا ہے۔

اعتراض کرنے والا اعتراض کر سکتا ہے کہ اس طرح تو خدا نے انسانی عقل و روح کی آزادی سلب کر لی، حالانکہ ابھی تم یہ ثابت کر رہے تھے کہ خدا کی الٰہیت انسان کو عقل و فکر اور جسم و جان کی آزادی عطا کرتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قانون سازی کا اختیار اللہ نے اپنے ہاتھ میں انسان کی فطری آزادی سلب کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس کو محفوظ کرنے کے لیے لیا ہے۔ اس کا مقصد انسان کو بے راہ ہونے اور اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے سے بچانا ہے۔

یہ مغرب کی نام نہاد ڈیموکریسی جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس میں عمومی حاکمیت (Popular Sovereignty) ہوتی ہے، اس کا ذرا تجزیہ کر کے دیکھیے۔ جن لوگوں سے مل کر کوئی اسٹیٹ بنتا ہے، وہ سب کے سب نہ تو خود قانون بناتے ہیں اور نہ خود اس کو نافذ کرتے ہیں۔ انہیں اپنی حاکمیت چند مخصوص لوگوں کے سپرد کرنی پڑتی ہے تاکہ ان کی طرف سے وہ قانون بنائیں اور اسے نافذ کریں۔ اسی غرض سے انتخاب کا ایک نظام مقرر کیا جاتا ہے لیکن اس انتخاب میں زیادہ تر وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو عوام کو اپنی دولت، اپنے علم، اپنی چالاکی اور اپنے جھوٹے پروپیگنڈے کے زور سے بیوقوف بنا سکتے ہیں۔ پھر یہ خود عوام کے ووٹ ہی سے ان کے اِلٰہ بن جاتے ہیں۔ عوام کے فائدے کے لیے نہیں، بلکہ اپنے شخصی اور طبقاتی فائدے کے لیے قوانین بناتے ہیں اور اسی طاقت سے جو عوام نے ان کو دی ہے۔ ان قوانین کو عوام پر نافذ کرتے ہیں۔ یہی مصیبت امریکا میں ہے۔ یہی انگلستان میں ہے اور یہی ان سب ممالک میں ہے جن کو جمہوریت کی جنت ہونے کا دعویٰ ہے۔

پھر اس پہلو کو نظر انداز کر کے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہاں عام لوگوں ہی کی مرضی سے قانون بنتے ہیں تب بھی تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عام لوگ خود بھی اپنے مفاد کو نہیں سمجھ سکتے۔ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ یہ اپنی زندگی کے اکثر معاملات میں حقیقت کے بعض پہلوؤں کو دیکھتا ہے اور بعض کو نہیں دیکھتا۔ اس کا فیصلہ (Judgment) عموماً یکطرفہ ہوتا ہے۔ اس پر جذبات اور خواہشات کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ خالص عقلی اور علمی حیثیت سے بے لاگ رائے بہت کم قائم کر سکتا ہے۔ بسا اوقات عقلی اور علمی حیثیت سے جو بات اس پر روشن ہو

جاتی ہے اس کو بھی یہ جذبات و خواہشات کے مقابلہ میں رد کر دیتا ہے۔ اس کے ثبوت میں بہت سی مثالیں میرے سامنے ہیں۔ مگر طوالت سے بچنے کے لیے صرف امریکا کے قانون منع شراب (Prohibition Law) کی مثال پیش کروں گا۔ علمی اور عقلی حیثیت سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ شراب صحت کے لیے مضر ہے، عقلی و ذہنی قوتوں پر برا اثر ڈالتی ہے اور انسانی تمدن میں فساد پیدا کرتی ہے۔ انہی حقائق کو تسلیم کر کے امریکا کی رائے عام اس بات کے لیے راضی ہوئی تھی کہ منع شراب کا قانون پاس کیا جائے۔ چنانچہ عوام کے ووٹ ہی سے یہ قانون پاس ہوا تھا۔ مگر جب وہ نافذ کیا گیا تو انہی عوام نے جن کے ووٹ سے وہ پاس ہوا تھا، اس کے خلاف بغاوت کی۔ بدتر سے بدتر قسم کی شرابیں ناجائز طور پر بنائیں اور پیں، پہلے سے کئی گنا زیادہ شراب کا استعمال ہوا۔ جرائم میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ آخر کار انہی عوام کے ووٹوں سے وہ شراب جو حرام کی گئی تھی، حلال کر دی گئی۔ یہ حرمت کا فتویٰ حلت سے بدلا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علمی و عقلی حیثیت سے اب شراب کا استعمال مفید ثابت ہو گیا تھا۔ بلکہ صرف یہ وجہ تھی کہ عوام اپنی جاہلانہ خواہشات کے بندے بنے ہوئے تھے، انہوں نے اپنی حاکمیت اپنے نفس کے شیطان کی طرف منتقل کر دی تھی، اپنی خواہش کو اپنا اِلٰہ بنا لیا تھا اور اس اِلٰہ کی بندگی میں وہ اس قانون کو بدلنے پر مصر تھے جسے انہوں نے خود ہی علمی اور عقلی حیثیت سے صحیح تسلیم کر کے پاس کیا تھا۔ اس قسم کے اور بہت سے تجربات ہیں، جن سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ انسان خود اپنا واضح قانون (Legislature) بننے کی پوری اہلیت نہیں رکھتا۔ اگر اس کو دوسرے الٰہوں کی بندگی سے رہائی مل بھی جائے تو وہ اپنی جاہلانہ خواہشات کا بندہ بن جائے گا۔ اپنے نفس کے شیطان کو اِلٰہ بنا لے گا۔ لہٰذا وہ اس کا محتاج ہے کہ اس کی آزادی پر خود اس کے اپنے مفاد میں مناسب حدیں لگا دی جائیں۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہ قیود عائد کی ہیں جن کو اسلام کی اصطلاح میں ''حدود اللہ'' (Devine Laws) کہا جاتا ہے۔ یہ حدودِ زندگی کے ہر شعبہ میں چند اصول، چند ضوابط اور چند قطعی احکام پر مشتمل ہیں جو اس شعبہ کے اعتدال و توازن کو برقرار رکھنے کے لیے لگائی گئی ہیں۔

ان کا منشا یہ ہے کہ یہ تمہاری آزادی کی آخری حدیں ہیں۔ان کے اندر رہ کر تم اپنے برتاؤ کے لیے ضمنی اور فروعی قاعدے (Regulations) بنا سکتے ہو۔مگر ان حدود سے تجاوز کرنے کی تمہیں اجازت نہیں ہے۔ان سے تجاوز کرو گے تو تمہاری اپنی زندگی کا نظام فاسد و مختل ہو جائے گا۔

حدود اللہ کا مقصد

مثال کے طور پر انسان کی معاشی زندگی کو لیجیے۔اس میں اللہ تعالیٰ نے شخصی ملکیت کا حق، زکوٰۃ کی فرضیت، سود کی حرمت، جوئے اور سٹے کی ممانعت، وراثت کا قانون اور دولت کمانے، جمع کرنے اور خرچ کرنے پر پابندیاں عائد کر کے چند سرحدی نشانات لگا دیے ہیں۔اگر انسان ان نشانات کو برقرار رکھے اور ان کے اندر رہ کر اپنے معاملات کی تنظیم کر لے تو ایک طرف شخصی آزادی (Personal Liberty) بھی محفوظ رہتی ہے اور دوسری طرف طبقاتی جنگ (Class-war) اور ایک طبقہ پر دوسرے طبقہ کے تسلط کی وہ حالت بھی پیدا نہیں ہو سکتی جو ظالمانہ سرمایہ داری سے شروع ہو کر مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ پر منتہی ہوتی ہے۔

اسی طرح عائلی زندگی (Family Life) میں اللہ نے حجابِ شرعی، مرد کی قوامیت، شوہر بیوی، بچوں اور والدین کے حقوق و فرائض، طلاق اور خلع کے احکام، تعدد ازواج کی مشروط اجازت، زنا اور قذف کی سزائیں مقرر کر کے ایسی حدیں کھڑی کر دی ہیں کہ اگر انسان ان کی ٹھیک ٹھیک نگہداشت کرے اور ان کے اندر رہ کر اپنی خانگی زندگی کو منضبط کر لے تو نہ گھرانہ ظلم و ستم کی دوزخ بن سکتے ہیں اور نہ ان گھروں سے عورتوں کی شیطانی آزادی کا وہ طوفان اٹھ سکتا ہے جو آج پوری انسانی تہذیب کو غارت کر دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

اسی طرح انسانی تمدن و معاشرت کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے قصاص کا قانون، چوری کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا، شراب کی حرمت، جسمانی ستر کے حدود اور ایسے چند مستقل قاعدے مقرر کر کے فساد کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے ہیں۔

میرے لیے اتنا موقع نہیں ہے کہ میں حدود اللہ کی ایک مکمل فہرست آپ کے سامنے پیش

کر کے تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ انسانی زندگی میں توازن واعتدال قائم کرنے کے لیے ان میں سے ایک ایک حد کس قدر ضروری ہے۔ یہاں میں صرف یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ سے ایک ایسا مستقل ناقابلِ تغیر و تبدل دستور (Constitution) بنا کر انسان کو دے دیا ہے جو اس کی روحِ آزادی کو سلب اور اس کی عقل و فکر کو معطل نہیں کرتا' بلکہ اس کے لیے ایک صاف' واضح اور سیدھا راستہ مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنی جہالت اور اپنی کمزوریوں کے سبب سے تباہی کی بھول بھلیوں میں بھٹک نہ جائے' اس کی قوتیں غلط راستوں میں ضائع نہ ہوں اور وہ اپنی حقیقی فلاح وترقی کی راہ پر بڑھتا چلا جائے۔ اگر آپ کو کسی پہاڑی مقام پر جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ پُر پیچ پہاڑی راستوں میں جن کے ایک طرف عمیق غار اور دوسری طرف بلند چٹانیں ہوتی ہیں۔ سڑک کے کناروں کو ایسی رکاوٹوں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے کہ مسافر غلطی سے کھڈ کی طرف نہ چلا جائے۔ کیا ان رکاوٹوں کا مقصد راہ رو کی آزادی سلب کرنا ہے؟ نہیں! دراصل ان سے مقصد یہ ہے کہ اس کو ہلاکت سے محفوظ رکھا جائے اور ہر پیچ' ہر موڑ اور ہر امکانی خطرے کے موقع پر اسے بتایا جائے کہ تیرا راستہ اُدھر نہیں اِدھر ہے۔ تجھے اُس رخ پر نہیں اِس رُخ پر مڑنا چاہیے تاکہ تو سلامت اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ سکے۔ بس یہی مقصد اُن حدود کا بھی ہے جو خدا نے اپنے دستور میں مقرر کی ہیں۔ یہ حدیں انسان کے لیے زندگی کے سفر کا صحیح رخ معین کرتی ہیں اور ہر پُر پیچ مقام' ہر موڑ اور ہر دوراہے پر اسے بتاتی ہیں کہ سلامتی کا راستہ اس طرف ہے۔ تجھے ان سمتوں پر نہیں بلکہ اس سمت پر پیش قدمی کرنی چاہیے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں خدا کا مقرر کیا ہوا یہ دستور ناقابلِ تغیر و تبدل ہے۔ اگر آپ چاہیں تو بعض مغربیت زدہ مسلمان ملکوں کی طرح' اس دستور کے خلف بغاوت کر سکتے ہیں مگر اس کو بدل نہیں سکتے۔ یہ قیامت تک کے لیے اٹل دستور ہے۔ اسلامی اسٹیٹ جب بنے گا اسی دستور پر بنے گا۔ جب تک قرآن اور سنتِ رسولؐ دنیا میں باقی ہے' اُس دستور کی ایک دفعہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹائی جا سکتی۔ جس کو مسلمان رہنا ہو' وہ اس کی پابندی پر مجبور ہے۔

اسلامی اسٹیٹ کا مقصد

اس دستور کی حدود کے اندر جو اسٹیٹ بنے، اس کے لیے ایک مقصد بھی خدا نے متعین کر دیا ہے اور اس کی تشریح قرآن میں متعدد مقامات پر کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ... (الحدید:۲۵)

''ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور ہم نے لوہا اتارا جس میں زبردست طاقت ہے اور لوگوں کے لیے فائدے ہیں''۔

اس آیت میں لوہے سے مراد سیاسی قوت ہے اور رسولوں کا کام یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی واضح ہدایات اور اپنی کتاب میں جو میزان اُن کو دی ہے، یعنی جس ٹھیک ٹھیک متوازن (Well-Balancea) نظامِ زندگی کی طرف ان کی رہنمائی فرمائی ہے، اس کے مطابق اجتماعی عدل (Social Justice) قائم کریں۔ دوسری جگہ فرمایا:

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ... (الحج:۴۱)

''یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں تمکن وحکومت عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے''۔

ایک اور جگہ فرمایا:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ... (آلِ عمران:۱۱۰)

''تم وہ بہترین جماعت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے، تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔

ایجابی اسٹیٹ

ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن جس اسٹیٹ کا تخیل پیش کر رہا ہے' اس کا مقصد سلبی (Negative) نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایجابی (Positive) مقصد اپنے سامنے رکھتا ہے اس کا مدعا صرف یہی نہیں ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے روکے' ان کی آزادی کی حفاظت کرے اور مملکت کو بیرونی حملوں سے بچائے۔ بلکہ اس کا مدعا اجتماعی عدل کے اس متوازن نظام کو رائج کرنا ہے جو خدا کی کتاب پیش کرتی ہے۔ اس کا مقصد بدی کی ان تمام صورتوں کو مٹانا اور نیکی کی ان تمام شکلوں کو قائم کرنا ہے جن کو خدا نے اپنی واضح ہدایات میں بیان کیا ہے۔ اس کام میں حسبِ موقع و محل سیاسی طاقت بھی استعمال کی جائے گی' تبلیغ و تلقین سے بھی کام لیا جائے گا' تعلیم و تربیت کے ذرائع بھی کام میں لائے جائیں گے اور جماعتی اثر اور رائے عام کے دباؤ کو بھی استعمال کیا جائے گا۔

ہمہ گیر اسٹیٹ

اس نوعیت کا اسٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اسٹیٹ ہے۔ اس کا دائرۂ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبہ کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشسٹی اور اشترا کی حکومتوں سے یک گونہ مماثلت رکھتا ہے' مگر آگے چل کر آپ دیکھیں گے' اس ہمہ گیریت کے باوجود اس میں موجودہ زمانے کی کلی (Totalitarian) اور استبدادی (Authoritarian) حکومتوں کا سا رنگ نہیں ہے۔ اس میں شخصی آزادی سلب نہیں کی جاتی اور نہ اس میں آمریت پائی جاتی ہے۔ اس معاملہ میں جو کمال درجہ کا اعتدال اسلامی نظامِ حکومت میں قائم کیا گیا ہے اور حق و باطل کے درمیان جیسی نازک اور باریک سرحدیں قائم کی گئی ہیں' انہیں دیکھ کر ایک صاحبِ بصیرت آدمی کا دل گواہی دینے لگتا ہے کہ ایسا متوازن نظام حقیقت میں خدائے حکیم و خبیر ہی وضع کر سکتا ہے۔

جماعتی اور اصولی اسٹیٹ

دوسری بات جو اسلامی اسٹیٹ کے دستور اور اس کے مقصد اور اس کی اصلاحی نوعیت پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایسے اسٹیٹ کو صرف وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے دستور پر ایمان رکھتے ہوں' جنھوں نے اس کے مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہو' جو اس کے اصلاحی پروگرام سے نہ صرف پوری طرح متفق ہوں' نہ صرف اس میں کامل عقیدہ رکھتے ہوں' بلکہ اس کی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہوں اور اس کی تفصیلات سے بھی واقف ہوں۔ اسلام نے اس باب میں کوئی جغرافیائی کوئی لسانی قید نہیں رکھی ہے۔ وہ تمام انسانوں کے سامنے اپنے دستور' اپنے مقصد اور اپنے اصلاحی پروگرام کو پیش کرتا ہے جو شخص بھی اسے قبول کر لے خواہ وہ کسی نسل' کسی ملک اور کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو وہ اس جماعت میں شریک ہو سکتا ہے جو اس اسٹیٹ کو چلانے کے لیے بنائی گئی ہے اور جو اسے قبول نہ کرے اسے اسٹیٹ کے کام میں دخیل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اسٹیٹ کے حدود میں ذمی (Protected Citizen) کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔ اس کے لیے اسلام کے قانون میں معین حقوق اور مراعات موجود ہیں۔ اس کی جان و مال اور عزت کی پوری حفاظت کی جائے گی۔ لیکن بہرحال اس کو حکومت میں شریک کی حیثیت نہ دی جائے گی۔ کیونکہ یہ ایک اصولی ریاست ہے جس کے نظم و نسق کو وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے اصولوں کو مانتے ہوں۔

یہاں بھی اسلامی اسٹیٹ اور کمیونسٹ اسٹیٹ میں یک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ لیکن دوسرے مسلکوں پر اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ جو برتاؤ اشتراکی جماعت کا اسٹیٹ کرتا ہے اس کو اس برتاؤ سے کوئی نسبت نہیں جو اسلامی اسٹیٹ کرتا ہے۔ اسلام میں وہ صورت نہیں جو کمیونسٹ حکومت میں ہے کہ غلبہ و اقتدار حاصل کرتے ہی اپنے تمدنی اصولوں کو دوسروں پر بجبر مسلط کر دیا جائے' جائیدادیں ضبط کی جائیں' قتل و خون کا بازار گرم ہو اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو پکڑ کر زمین کے جہنم' سائبیریا کی طرف پیک کر دیا جائے۔ اسلام نے غیر مسلموں کے لیے جو فیاضانہ برتاؤ اپنے اسٹیٹ میں اختیار کیا ہے اور اس بارے میں عدل و ظلم اور راستی و

ناراستی کے درمیان جو ایک خطِ امتیاز کھینچا ہے' اسے دیکھ کر ہر انصاف پسند آدمی بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو مصلح آتے ہیں' وہ کس طرح کام کرتے ہیں اور زمین میں جو مصنوعی اور جعلی مصلحین اٹھ کھڑے ہوتے ہیں' ان کا طریقِ کار کیا ہوتا ہے۔

نظریۂ خلافت اور اس کے سیاسی مضمرات

اب میں آپ کے سامنے اسلامی اسٹیٹ کی ترکیب اور اس کے طرزِ عمل کی تھوڑی سی تشریح کروں گا۔ یہ بات میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں اصلی حاکم اللہ ہے۔ اس اصل الاصول کو پیشِ نظر رکھ کر جب آپ اس سوال پر غور کریں گے کہ زمین میں جو لوگ خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لیے اٹھیں' ان کی حیثیت کیا ہونی چاہیے تو آپ کا ذہن خود بخود پکارے گا کہ وہ اصلی حاکم کے نائب ہونے چاہییں۔ ٹھیک ٹھیک یہی حیثیت اسلام نے بھی ان کو دی ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِيْ الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ... (النور:۵۵)

''اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا' اسی طرح جس طرح ان سے پہلے اس نے دوسروں کو خلیفہ بنایا تھا''۔

یہ آیت اسلام کے نظریۂ سیاست (Theory of State) پر نہایت صاف روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں دو بنیادی نکات بیان کیے گئے ہیں:

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اسلام حاکمیت کے بجائے خلافت (Vicegerency) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ چونکہ اس کے نظریہ کے مطابق حاکمیت خدا کی ہے لہٰذا جو کوئی اسلامی دستور

کے تحت زمین پر حکمران ہو' اسے لامحالہ حاکم اصلی کا خلیفہ (Vicegerent) ہونا چاہیے جو محض تفویض کردہ اختیارات (Delegated Power) استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔

دوسری کانٹے کی بات اس آیت میں یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوئی ہے' وہ عمومی خلافت (Popular Vicegereny) ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا نسل یا طبقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ ہر مومن اپنی جگہ خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً ہر ایک خدا کے سامنے جواب دہ ہے (کلکم راع و کلکم مسئول عن عیته) اور ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے فروتر نہیں ہے۔

اسلامی جمہوریت کی حیثیت

یہ ہے اسلام میں ڈیموکریسی کی اصل بنیاد۔ عمومی خلافت کے اس تصور کا تجزیہ کرنے سے حسبِ ذیل نتائج نکلتے ہیں:

ا۔ ایسی سوسائٹی جس میں ہر شخص خلیفہ ہو اور خلافت میں برابر کا شریک ہو' طبقات کی تقسیم اور پیدائشی یا معاشرتی امتیازات کو اپنے اندر راہ نہیں دے سکتی۔ اس میں تمام افراد مساوی الحیثیت اور مساوی المرتبہ ہوں گے۔ فضیلت جو کچھ بھی ہوگی' شخصی قابلیت اور سیرت کے اعتبار سے ہوگی۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بار بار بتصریح بیان فرمایا ہے:

لَیۡسَ لِاَحَدٍ فَضۡلٌ عَلٰی اَحَدٍ اِلَّا بِدِیۡنٍ وَّ تَقۡوٰی. اَلنَّاسُ کُلُّھُمۡ بَنُوۡ اٰدَمَ وَ اٰدَمُ مِنۡ تُرَابٍ لَافَضۡلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَّلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَّلَا لِاَبۡیَضَ عَلٰی اَسۡوَدَ وَلَا لِاَسۡوَدَ عَلٰی اَبۡیَضَ اِلَّا بِالتَّقۡوٰی. (الخطبۃ الوداع)

"کسی کو کسی پر فضیلت نہیں ہے۔ اگر ہے تو دین کے علم و عمل اور تقویٰ

کے اعتبار سے ہے۔ سب لوگ آدم کی اولاد سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی کو عربی پر' نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر فضیلت ہے تو تقویٰ کی بنا پر ہے''۔

فتح مکہ کے بعد جب تمام عرب اسلامی اسٹیٹ کے دائرے میں آ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنے خاندان والوں کو' جو عرب میں برہمنوں کی سی حیثیت رکھتے تھے' خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ اِنَّ اللهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَظُّمَهَا الْاٰبَآءَ. اَيُّهَا النَّاسُ كُلُّكُمْ مِنْ اٰدَمَ وَ اٰدَمَ مِنْ تُرَابٍ. وَا فَخْرَ لِلْاَنْسَابِ. لَا فَضْلَ لِلْعَرَبِيِّ عَلَى الْعَجَمِيِّ وَلَا لِلْعَجَمِيِّ عَلَى الْعَرَبِيِّ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقَاكُمْ.

''قریش والو! اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا پر فخر و ناز کو دور کر دیا۔ لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے' نسب کا فخر ہیچ ہے۔ عرب کو عجمی پر اور عجمی کو عرب پر کوئی فخر نہیں۔ تم میں بزرگ وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے''۔

۲۔ ایسی سوسائٹی میں کسی فرد یا کسی گروہِ افراد کے لیے اس کی پیدائش یا اس کے معاشرتی مرتبے (Social Status) یا اس کے پیشے کے اعتبار سے اس قسم کی رکاوٹیں (Disabilities) نہیں ہو سکتیں جو اس کی ذاتی قابلیتوں کے نشوونما اور اس کی شخصیت کے ارتقا میں کسی طرح بھی مانع ہوں۔ اس کو سوسائٹی کے تمام دوسرے افراد کی طرح ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہونے چاہییں۔ اس کے لیے راستہ کھلا ہوا ہونا چاہیے کہ اپنی قوت و استعداد کے لحاظ سے جہاں تک بڑھ سکتا ہے بڑھتا چلا جائے' بغیر اس کے کہ دوسروں کے اسی طور پر بڑھنے میں مانع ہو۔ یہ چیز اسلام میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ غلام اور غلام زادے فوجوں کے سپہ سالاروں اور صوبوں کے گورنر بنائے گئے اور بڑے بڑے اونچے گھرانوں کے شیوخ نے ان کی ماتحتی کی۔ چمار

جوتیاں گانٹھتے گانٹھتے اُٹھے اور امامت کی مسند پر بیٹھ گئے۔ جولا ہے اور بزاز مفتی اور قاضی اور فقیہ بنے اور آج ان کے نام اسلام کے بزرگوں کی فہرست میں ہیں۔ حدیث میں ارشاد ہوا کہ اِسۡمَعُوۡا وَاَطِیۡعُوۡا وَلَوۡ اُسۡتُعۡمِلَ عَلَیۡکُمۡ عَبۡدٌ حَبَشِیٌّ ''سنو اور اطاعت کرو اگر چہ تمہارا سردار ایک حبشی ہی کیوں نہ بنا دیا جائے''۔

۳۔ ایسی سوسائٹی میں کسی شخص یا گروہ (Group) کی ڈکٹیٹر شپ کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے کہ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے۔ کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں ہے کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمران بنایا جاتا ہے' اس کی اصلی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان یا اصطلاحی الفاظ میں تمام خلفاء اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لیے اس کی ذات میں مرکوز (Concentrate) کر دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف خدا کے سامنے جوابدہ ہے اور دوسری طرف ان عام خلفا کے سامنے جنھوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔ اب اگر وہ غیر ذمہ دار مطاع مطلق یعنی ڈکٹیٹر بنتا ہے تو خلیفہ کے بجائے غاصب کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ ڈکٹیٹر شپ دراصل عمومی خلافت کی نفی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی اسٹیٹ ایک ہمہ گیر اسٹیٹ ہے اور زندگی کے تمام شعبوں پر اس کا دائرہ وسیع ہے۔ مگر اس کلیت اور ہمہ گیری کی بنیاد یہ ہے کہ خدا کا وہ قانون ہمہ گیر ہے جسے اسلامی حکمران کو نافذ کرنا ہے۔ خدا نے زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق جو ہدایات دی ہیں' وہ یقیناً پوری ہمہ گیری کے ساتھ نافذ کی جائیں گی۔ مگر ان ہدایات سے ہٹ کر اسلامی حکمران خود ضابطہ بندی (Regimentation) کی پالیسی اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ لوگوں کو مجبور نہیں کر سکتا کہ فلاں پیشہ کریں اور فلاں پیشہ نہ کریں' فلاں فن سیکھیں اور فلاں نہ سیکھیں' اپنے بچوں کو فلاں قسم کی تعلیم دلوائیں اور فلاں قسم کی نہ دلوائیں۔ اپنے سر پر فلاں قسم کی ٹوپی پہنیں' اپنی زبان کے لیے فلاں رسم الخط اختیار کریں۔ اپنی عورتوں کو فلاں قسم کا لباس پہنائیں۔ یہ خداوندانہ اختیارات جو روس اور جرمنی اور اٹلی میں ڈکٹیٹروں نے اپنے ہاتھ میں لے لیے اور یا جن کو اتاترک نے ترکی میں استعمال کیا' اسلام نے وہ اختیارات امیر کو عطا نہیں کیے۔ علاوہ بریں

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اسلام میں ہر فرد شخصی طور پر خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ یہ شخصی جوابدہی (Personal Responsability) ایسی ہے جس میں کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ شریک نہیں۔ لہٰذا اس کو قانون کی حدود کے اندر پوری آزادی ہونی چاہیے کہ اپنے لیے جو راستہ چاہے اختیار کرے اور جدھر اس کا میلان ہو اپنی قوتوں کو اسی طرف بڑھنے کے لیے استعمال کرے۔ اگر امیر اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالے گا تو وہ خود اس ظلم کے لیے اللہ کے ہاں پکڑا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آپ کے خلفاے راشدین کی حکومت میں ضابطہ بندی کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔

۴۔ ایسی سوسائٹی میں ہر عاقل و بالغ مسلمان کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہیے، اس لیے کہ وہ خلافت کا حامل ہے۔ خدا نے اس خلافت کو کسی خاص معیارِ لیاقت یا کسی معیار ثروت سے مشروط نہیں کیا ہے، بلکہ صرف ایمان وعمل صالح سے مشروط کیا ہے۔ لہٰذا رائے دہی میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ مساوی حیثیت رکھتا ہے۔

انفرادیت اور اجتماعیت کا توازن

ایک طرف اسلام نے یہ کمال درجہ کی جمہوریت قائم کی ہے۔ دوسری طرف ایسی انفرادیت (Individualism) کا سدباب کر دیا ہے جو اجتماعیت (Socialism) کی نفی کرتی ہو۔ یہاں افراد و جماعت کا تعلق اس طرح قائم کیا گیا ہے کہ نہ فرد کی شخصیت میں جماعت میں گم ہو جائے جس طرح کمیونزم اور فاشزم کے نظام اجتماعی میں ہو جاتی ہے اور نہ فرد اپنی حد سے اتنا بڑھ جائے کہ جماعت کے لیے نقصان دہ ہو جیسا کہ مغربی جمہوریتوں کا حال ہے۔ اسلام میں فرد کا مقصدِ حیات وہی ہے جو جماعت کا مقصدِ حیات ہے۔ یعنی قانونِ الٰہی کا نفاذ اور رضاے الٰہی کا حصول۔ مزید برآں اسلام میں فرد کے حقوق پوری طرح تسلیم کرنے کے بعد اس پر جماعت کے لیے مخصوص فرائض بھی عائد کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح انفرادیت اور اجتماعیت میں ایسی موافقت پیدا ہوگئی ہے کہ فرد کو اپنی قوتوں کے نشوونما کا پورا موقع بھی ملتا ہے

پھر وہ اپنی ان ترقی یافتہ قوتوں کے ساتھ اجتماعی فلاح و بہبود میں مددگار بھی بن جاتا ہے۔ یہ ایک مستقل بحث ہے جس پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کا یہاں موقع نہیں۔ اس کی طرف اشارہ کرنے سے میرا مقصد صرف ان غلط فہمیوں کا سدباب کرنا تھا جو اسلامی جمہوریت کی مذکورہ بالا تشریح سے پیدا ہو سکتی تھیں۔

(نوٹ: مزید تفصیل کے لیے دیکھیے مصنف کی کتاب ''اسلامی ریاست''۔ شائع کردہ ''اسلامک پبلی کیشنز'' لاہور)